# روشن خیال اعتدال پسندی کی حقیقت ......(۱)

سینیئر پروفیسر خورشید احمد

"روشن خیالی" اور "اعتدال پسندی" بڑے خوش نما الفاظ ہی نہیں' بڑے دل پذیر تصورات بھی ہیں' اگر مسلمان تہذیب و ثقافت' معاشرت اور شریعت پر اسلام کے فکری' نظریاتی اور اخلاقی تناظر میں غور کیا جائے تو یہ اس دین اور تہذیب کی امتیازی خصوصیات میں سے ہیں۔ اس لئے اگر روشن خیال اعتدال پسندی کی بات کی جائے تو اس پر تعجب یا اعتراض کچھ بے محل معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مشکل یہ آپڑی ہے کہ آج جس روشن خیال اعتدال پسندی کی بات کی جارہی ہے اس کا پس منظر ہمارا اپنا دین ہماری اپنی تہذیب ہماری اپنی روایت اور ہماری ضرورت نہیں بلکہ وہ ایک خاص تاریخی عمل کا حصہ بن گئی ہے اور دنیا کے خصوصیت سے مسلم دنیا کے لئے جس نئے سیاسی اور تہذیبی نقشے میں رنگ بھرا جارہا ہے اس کا اہم رنگ ہے۔ عالمی حالات اور رجحانات کا جائزہ لیجئے تو صاف نظر آرہا ہے کہ اس کا تعلق بیرونی دباؤ اور مطالبات سے ہے۔

جو نیا عالمی نظام وضع کیا جارہا ہے وہ استعمار کی سب سے جامع اور گھمبیر صورت ہے جس میں عسکری' سیاسی' معاشی اور ثقافتی پہلو مساوی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کا ہدف دنیا کے تمام ممالک اور اقوام کو ایک سپر پاور امریکہ کی صرف سیاسی اور عسکری چھتری تلے لانا نہیں بلکہ فکری' معاشی' مالیاتی اور ثقافتی طور پر بھی ایک ہی نظام اقدار سب پر مسلط کرنے کا منصوبہ ہے۔ اسے جبر و اختیار اور ترغیب و ترہیب کے ہر ممکنہ ذرائع کے استعمال سے کامیاب کرانا مقصود ہے۔ اس ہمہ جہتی حکمت پر سرد جنگ کے دور کے ختم ہونے کے بعد سے' بڑی چابک دستی سے عمل کیا جارہا ہے اور گیارہ ستمبر کے بعد کے اقدامات اس وسیع تر حکمت عملی کا حصہ ہیں۔ اس سمجھے بغیر روشن خیالی اور میانہ روی کی جو آوازیں آج اٹھ رہی ہیں' ان کی حقیقت اور مضمرات کو سمجھنا ممکن نہیں۔ اس 'روشن خیالی اعتدال پسندی' کا کوئی تعلق ہماری اپنی ضروریات سے نہیں' یہ ہمارے اپنے تہذیبی لنگر سے مربوط اور وابستہ نہیں بلکہ یہ عنوان ہے اس تبدیلی کا جو اسلام اور مسلم معاشرے اور تہذیب کو اس کی اپنی اساس سے ہٹا کر مغرب سے ہم آہنگ کرنے کیلئے کی جارہی ہے اور آج سے نہیں سامراج کی یلغار کے پہلے دور ہی سے کی جارہی ہے۔ البتہ استعمار کی تازہ یورش میں اس کو ایک زیادہ مرکزی کردار دیا گیا ہے۔

گزشتہ ربع صدی میں امریکی دانش ور' پالیسی ساز اور میڈیا ایک نئی تہذیبی جنگ میں مصروف ہے اور اس کا ہدف مغرب کے لبرل' معاشی اور سیاسی نظام کو پوری دنیا پر مسلط کرنا ہے۔ اس پوری حکمت عملی کو مشہور امریکی رسالہ فارن پالیسی کے ایڈیٹر جوزف نائی نے اپنے ایک مضمون میں کسی تکلف کے بغیر مختصر طور پر بیان کردیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"عالمی سیاست میں طاقت کی نوعیت میں تبدیلی آرہی ہے۔ طاقت کا مطلب یہ ہے کہ آپ جو حاصل کرنا چاہتے ہیں حاصل کریں اور اگر ضروری ہو تو اسے امر واقع بنانے کیلئے دوسروں کے رویوں کو تبدیل کردیں"۔

(Re-Ordering the World: The long term implications of 11th sept: ed by Mark loonar. Fore-word by Tony Blair. The Foreign Policy Center, London 2002).

اس کیلئے روایتی طور پر سب سے اہم ذریعہ جنگ رہی ہے اور ایک عظیم طاقت کی قوت کا پیمانہ جنگ کی استعداد ہی ہوا کرتا ہے۔ تاریخ کا سبق یہی ہے کہ:

جنگ وہ آخری اور قطعی کھیل ہے جس میں عالمی سیاست کے کارڈ کھیلے جاتے ہیں اور طاقت کا تناسب ثابت کیا جاتا ہے۔

البتہ اب نیوکلیئر اسلحے کے ایک کارفرما قوت بن جانے سے حالات کروٹ لے رہے ہیں۔ نیز دنیا کی مختلف اقوام میں قومیت کے تصور کے جاگزیں ہو جانے سے عالمی سیاست کے دروبست میں تبدیلی آگئی ہے۔ اسی طرح عالمی سرمایہ داری کی موجودہ شکل جس میں معاشی فوائد کا حصول' دنیا کے ممالک کی منڈیوں پر قبضے کے ذریعے ان سے فائدہ اٹھانے کے اسلوب' کثیر القومی کمپنیوں کا کردار یہ سب جنگ اور محض قوت کے ذریعے دوسروں کو قبضے میں رکھنے کو اگر مشکل نہیں تو مہنگا بنائے جارہے ہیں۔ اس کے نتیجے میں فوجی اور معاشی قوت جسے وہ Hard Power کہتا ہے مؤثر تو ہیں لیکن اب جن عوامل کا کردار بڑھ رہا ہے انہیں جوزف نائی Soft Power کہتا ہے۔

اس صورت میں یہ بات اہمیت رکھتی ہے کہ عالمی سیاست کا ایجنڈا ترتیب دیا جائے اور دوسروں کو فوجی اور اقتصادی ہتھیاروں کی دھمکی یا استعمال کے ذریعے بزور طاقت اس طرف لایا جائے۔ طاقت کا یہ پہلو کہ دوسرے وہ چاہنے لگیں جو آپ چاہتے ہیں' نرم طاقت کہا جاتا ہے۔ نرم طاقت کا انحصار سیاسی ایجنڈے کو اس طرح ترتیب دینے کی قابلیت پر ہوتا ہے جو دوسروں کی ترجیحات کا تعین کرے۔

اس حکمت عملی پر مؤثر عمل کیلئے ابلاغ کی قوت کا استعمال مرکزی اہمیت رکھتا ہے اور اقتصادی قوت کا ہدف افکار' اقدار' کلچر کی تبدیلی ہے۔ اس نئی جنگ میں اصل مزاحم قوت مقابل تہذیب کا عقیدہ' نظریہ' اصول اور اقدار بن جاتے ہیں۔ اسلامی دنیا میں عوام کی اسلام سے وابستگی اور اپنی تہذیب اور اقدار کے لئے استقامت...... مغرب کیلئے سب سے بڑا دردِ سر بنی ہوئی ہے۔ جوزف نائی اعتراف کرتا ہے کہ:

یقینی طور پر ایسے علاقے ہیں جیسے شرق اوسط جہاں امریکی کلچر کے حوالے سے گومگو یا مکمل مخالفت کی کیفیت اس کی نرم طاقت کو محدود کردیتی ہے۔

یہ ہے اصل مخمصہ اور اس کا حل تجویز ہوا ہے مسلم ممالک میں روشن خیالی اور اعتدال پسندی کی حکمت عملی کا فروغ کہ اس طرح مسلم دنیا کو اسکی اپنی بنیادوں سے ہلا کر مغرب کے رنگ میں رنگنے کے امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے مسلمان عورت کا حجاب بھی توپ اور میزائل کی طرح خطرناک تصور کیا جاتا ہے۔ اسلام سے مسلمانوں کی وابستگی اور اپنی ثقافت اور روایت سے محبت مغرب کی نگاہ میں اسکے عزائم کے حصول کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اسلام میں دین و سیاست کا ناقابل تقسیم ہونا اصل سد راہ ہے۔

جہاد کا جذبہ جو دفاع کا موثر ترین ذریعہ ہے ان کی آنکھوں کا کانٹا ہے۔ مسئلہ بنیاد پرستی نہیں اسلام کا ایک مکمل نظام زندگی ہونے کا تصور ہے۔ یہ مغرب کی نگاہ میں اصل سنگ راہ ہے۔ ایک جرمن مستشرق خاتون اینڈریا لوئیگ اپنے ایک مضمون The Perception of Islam in Western Debate میں صاف الفاظ میں مغرب کے دانشوروں کے اس یقین کو یوں پیش کرتی ہے:

مغرب اسلام کو ایک ایسے مذہب کے طور پر زیر بحث لاتا ہے جو اسلامی ممالک کے بے شمار سیاسی' ثقافتی اور سماجی مظاہر کا ذمہ دار ہے۔ یہ بالکل واضح ہے کہ اسلام ایک مذہب کی حیثیت سے مغربی ممالک میں خوف پیدا کرتا ہے۔ مذہب کا وہ خوف جو ہمارا خیال ہے کہ ہم نے اپنے روشن خیال معاشروں سے ختم کردیا ہے۔

The Next Threat: Perception of Islam. ed, by Jochen Hepplla and andrea Lüeg, Pluto Press, London 1995, p-27

اس کتاب میں نیویارک ٹائمز میگزین کے 31 مئی 1992ء کے شمارے میں جے ملر کے ایک مضمون The Islamic Wave کا حوالہ قابل غور ہے:

مغرب اسلام کی بڑھتی ہوئی سیاسی مقبولیت کو خطرناک' ایک رخی اور عجیب قرار دیتا ہے۔ جنگجو اسلام کے فروغ نے اس شدید بحث کا آغاز کردیا ہے کہ مغرب اس کے بارے میں کیا کچھ کرسکتا ہے یا کرنا چاہئے۔ کچھ امریکی سرکاری افسران اور مبصرین نے پہلے ہی جنگجو اسلام کو مغرب کا اگلا دشمن قرار دے دیا ہے جس کو اسی طرح قابو میں رکھنے کی ضرورت ہے جس طرح سرد جنگ میں کمیونزم کو کیا گیا تھا۔

(ص۔۱۳۱)(جاری ہے)